مولاناعبیداللہ سندھی کا نظریہ قومیت

Maulana Obaidullah Sindhi's Theory of Nationalism

Dr Shahid Rasheed
Assistant Professor Department of Sociology
FC College University Lahore
Email: shahidrasheed@fccollege.edu.pk

Abstract
This paper aims to understand and analyze Maulana Obaidullah Sindhi's formulation of Nationalism, Maulana Obaidullah Sindhi, arguably, is one of the most dynamic luminary of Twentieth century Muslim South Asia. He got the opportunity to keenly observe the social and political upheavals and revolutions of the Twentieth century. He participated in the struggle for the freedom of united India and remained in exile for twenty-four years. His theory of nationalism therefore is based on ground realities of history and politics rather than idealistic and imaginative elements. This paper delineates clearly Maulana Sindhi's concept of nationalism and indicates its differences with the more popular and widespread notions of nationalism.
Keywords: Nationalism, Maulana Sindhi, Muslim India, South Asia, Twentieh century, Nation

دارالعلوم دیوبند شاہ ولی اللہ دہلوی کی اصلاحی تحریک کا نتیجہ تھا، شیخ محمد اکرام کے مطابق[1] دیوبند نے صرف جُزوی طور پر شاہ ولی اللہ کی سوچ کی پیروی کی۔ لیکن دیوبند کے ایک عالم جو نہ صرف نظریات بلکہ شاہ ولی اللہ کی فکر کے منہج اور طریقہ کار پر عمل پیرا تھے وہ مولانا عبیداللہ سندھی تھے[2]۔ شاہ ولی اللہ کا اصولی طریقہ یہ ہے کہ بظاہر اختلافی یا مخالف خیالات کی تطبیق کی جائے۔ جیسے شاہ ولی اللہ نے حدیث کو فقہ کے ساتھ، فقہ شافعی کو فقہ حنفی کے ساتھ، ابن العربی کے وحدت الوجود کو شیخ احمد سرہندی کے[3] وحدت الشہود کے ساتھ، اور عقل کو نقل کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، ٹھیک اسی طرح مولانا عبیداللہ سندھی نے[4] مشرقی روحانیت اور مغربی مادیت میں تطبیق کی کوشش کی۔

مولانا سندھی کی زندگی جدوجہد سے بھرپور تھی۔ آپ ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے کم عمری میں ہی اسلام قبول کیا اور پھر روایتی اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دیوبند پہنچ گئے۔ یہاں اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے زیر اثر برطانوی استعمار کے خلاف سیاسی جدوجہد کا حصہ بنے۔ انھوں نے دیوبند کے سابق طلباء کی ایک انجمن 'جمعیت الانصار' قائم کی۔ ایک الٰہیاتی تنازعہ کے بعد انھیں دیوبند سے نکال دیا گیا اور شیخ الہند کی کی دعائے فضل و رحمت سے انھوں نے علی گڑھ اور دیوبند کے فارغ التحصیل افراد کے درمیان خلیج کو ختم کرنے کے لیے

ایک تعلیمی ادارہ 'نظارۃ المعارف القرآنیہ' قائم کیا۔ یہاں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مختار احمد انصاری، اور حکیم اجمل خان سمیت کئی مسلم قوم پرست رہنماؤں سے ملاقات کی۔ انھوں نے افغانستان[5]، روس، ترکی اور حجاز کا سفر کیا اور چوبیس سال جلاوطنی میں گزارے۔ آپ نے بہت سے سیاسی انقلابات کا مشاہدہ کیا اور شاید پورے جنوبی ایشیا اور عرب مشرق وسطیٰ میں روایتی اسلامی علوم سے واقفیت کے حامل ان کے کسی بھی ہم عصر مسلم عالم کو اُن کی طرح سیاسی جدیدیت کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ افغانستان، روس اور ترکی میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور انقلابات کا مشاہدہ کرنے کے بعد مولانا سندھی نے تقریباً بارہ سال حجاز میں اپنی جدوجہد، روحِ عصر، شاہ ولی اللہ کی حکمت اور قرآن کے آفاقی پیغام پر غور و فکر کرتے ہوئے گزارے۔ انھوں نے بہت سے طلباء کو قرآن کی تفسیر لکھوائی اور ان تفاسیر میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی روشنی میں قرآنی فکر کی تشکیل نو کی کوشش کی[6]۔

مولانا سندھی بیک وقت تین فکری اور سیاسی تحریکوں سے متاثر تھے: شاہ ولی اللہ کا فلسفہ اور تحریک، روسی اشتراکیت، اور کمال اتاترک کی قوم پرست تحریک[7]۔ مولانا سندھی نے ایک اصطلاح "یورپین ازم" وضع کی جس سے ان کی مراد یورپ کا سماجی، معاشی اور سائنسی انقلاب تھا۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ "یورپین ازم" کو اختیار کریں۔ 1939ء میں ہندوستان واپسی پر انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ "بیک وقت یورپی مادی ترقی، اس کی اقتصادی تنظیم اور شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کو اپنائیں۔ اس طرح وہ اس دنیا میں ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دین کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں"[8]۔

> "یہ میرا غیر متزلزل یقین ہے کہ اسلام کا مستقبل بہت روشن ہے اور یہ ایک بار پھر پوری قوت اور جوش کے ساتھ طلوع ہو گا۔ لیکن اس کا ظاہری ڈھانچہ وہ نہیں ہو گی جو اِس وقت ہے۔ جس طرح میں اسلام کی تجدید پر ایمان رکھتا ہوں اسی طرح مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اسلام کی موجودہ ڈھانچہ چند دنوں کی بات ہے۔ اسلام یقینی طور پر ایک نئی شکل اختیار کرے گا اور مسلمان جتنی جلدی اسلام کی اس نئی شکل کو اپنالیں گے اتنا ہی ان کے لیے بہتر ہو گا[9]۔

24 دسمبر 1939ء میں انھوں نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی کی بنیاد رکھی[10]۔ پارٹی کی سرگرمیاں تین علاقوں تک محدود تھیں، یعنی: (ا) سندھ جس کا مرکز کراچی میں ہے۔ (ب) وادی سندھ جس کا مرکز لاہور میں ہے۔ (ج) گنگا جمنا کا میدانی علاقہ جس کا مرکز دہلی ہے۔ دوسرے علاقے بھی اپنی آزاد رضامندی سے شامل ہو سکتے تھے۔ پارٹی کے بنیادی مقاصد میں پُرامن انداز میں آزادی کا حصول، کسانوں اور مزدوروں کے سماجی و معاشی حالات میں بہتری، ہندوستان کو ایک براعظم کے طور پر تسلیم کرنا، لوگوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم کا حصول، عوام الناس ووٹ کی

اہمیت سے متعلق شعور کی بیداری شامل تھے۔

مولاناسندھی نے جون 1939ء میں جمعیت علمائے ہند کے کلکتہ اجلاس سے اپنے صدارتی خطاب میں اس بات پر زور دیا کہ ہماری سیاست قومیت پر مبنی ہونی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ مذہبی رسم ورواج قومی سیاسی تحریک کا حصہ نہیں ہونے چاہئیں۔

مولاناسندھی آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادِ لاہور سے متفق نہیں تھے۔ انھوں نے مذہب اور قومیت کے تعلق کی مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آچاریہ کرپلانی (1982-1888)[11] ایک سندھی سیاست دان تھے جن کے چھوٹے بھائی مسلمان ہوئے[12] اور انھوں نے عبدالمجید سندھی[13] (1978-1889) کا نام اختیار کیا۔ مولاناسندھی کہتے ہیں کہ "اسلام قبول کرنے کے بعد نہ تو عبدالمجید کو اپنے وطن کی تاریخ سے بے دخل کیا گیا اور نہ ہی ان کے ہندو بھائی کو اب ہندوستان کی اجارہ داری ملی ہے۔ ایک شخص جو اسلام کے بلند نظریات سے متاثر ہو کر ہندو مذہب کو چھوڑ دیتا ہے وہ پھر بھی ہندوستانی رہتا ہے اور اجنبی یا غیر ملکی نہیں بن جاتا۔ تبدیلی فکر اور عقیدے میں آتی ہے، اپنے وطن سے تعلق میں نہیں۔ جب میں مسلمان نہیں تھا اس وقت بھی میرا وطن ہندوستان تھا۔ اب میں مسلمان ہوں اور اب بھی میرا وطن ہندوستان ہے۔ مذہب کی تبدیلی کا مطلب وطن کی تبدیلی نہیں ہے[14]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولاناسندھی اصولی طور پر اُمت کے تصور کے خلاف نہیں ہیں۔ وہ ہمیں کچھ تنظیموں سے وابستہ رومانویت اور سیاسی ناپختگی کے بارے میں خبردار کرتے ہیں جو اسلامی اتحاد کے اصول پر بنائی گئی ہیں لیکن سامراجی قوتوں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ اُن کی اپنی مجوّزہ ایشیاٹک فیڈریشن میں مسلمانوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ مولاناسندھی کے مطابق اقبال کی تصنیف 'خضرِراہ' اس سلسلے میں ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

جون 1941ء میں مدراس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولاناسندھی نے شرکت کی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اسلام کے بین الاقوامی سیاسی اتحاد کے تصور کو ترک کر دینا چاہیے کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی انتشار اور زوال کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے وطن کے بجائے مسلم ممالک کی طرف دیکھتے رہتے ہیں[15]۔

مولاناسندھی اسلامی اتحاد کے نظریات کے ساتھ سیاست کے منظرنامے پر وارد ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شیخ الہند کی ہدایت پر افغانستان بھی گئے۔ لیکن جدوجہد آزادی میں ان کی شرکت اور قومی اور بین الاقوامی سیاست کے ان کے گہرے مشاہدے نے انھیں یہ باور کرایا کہ اسلامی اتحاد کے ثمرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لہٰذا وہ اسلامی اتحاد کے سخت مخالف ہو گئے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف عربوں کی بغاوت سے انھیں پہلا جھٹکا لگا[16]۔ اس کے علاوہ

افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان نے بھی اُنھیں تلقین کی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں کی حمایت حاصل کریں۔ مولانا سندھی نے 1919 میں انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور 1922ء میں کابل کی ایک کانگریس کمیٹی قائم کی جس کا الحاق ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی مدد سے انڈین نیشنل کانگریس سے کیا گیا[17]۔ مولانا سندھی کی ان تمام سیاسی سرگرمیوں کو ان کے شاگرد اور رفیق ظفر حسن ایبک نے اپنی سوانح عمری 'خاطرات' میں قلمبند کیا ہے۔

1924ء میں مولانا سندھی نے مہابھارتہ سوراجیہ پارٹی قائم کی[18]۔ مولانا نے سوراجیہ پارٹی کے لیے ایک دستور مرتب کیا جو بنیادی طور پر آزاد ہندوستان کے دستور کا خاکہ ہے۔ یہ دستور اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا سندھی اپنی سیاسی بصیرت میں اپنے دور اور کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے بہت آگے تھے۔ یہ دستور ہندوستان کے تین اہم زمینی حقائق کو مدِ نظر رکھتا ہے: (ا) ہندوستان کا نسلی اور لسانی تنوع (ب) ہندوستان کا طبقاتی ڈھانچہ اور بالخصوص جاگیر دار طبقے اور مزارعین کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج اور (ج) ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ مسئلہ۔ مولانا نے اس دستور میں ان تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی طور پر اُردو میں شائع ہونے والے اس دستور کا انگریزی اور ترکی میں ترجمہ کیا گیا[19]۔ اس دستور کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

1۔ ایک آزاد ہندوستان جس میں جمہوری طرزِ حکومت ہو۔
2۔ تمام قومیتوں کو 'ایک ہندوستانی قوم' میں ضم کرنے سے انکار۔
3۔ جاگیر داری اور سرمایہ داری کا خاتمہ۔
4۔ ہندوستان کی تمام اقوام کو ایک ہندوستانی فیڈریشن میں یکجا کرنا۔
5۔ ایشیائی فیڈریشن کی تشکیل جو ایشیائی عوام کا سامراج مخالف اور سرمایہ داری مخالف اتحاد ہو گا۔
6۔ ہندوستان میں زبانوں اور ثقافتوں کے تنوع کی قبولیت۔
7۔ ہندوستان کی تین وسیع خطوں میں تقسیم: (1) شمال مغربی (2) شمال مشرقی (3) جنوبی۔ اِن میں سے ہر خطہ مختلف 'ممالک' پر مشتمل ہو گا۔
8۔ شمال مغربی خطہ "مہابھارت سوراجیہ" کہلائے گا اور یہ خطہ پارٹی کی سرگرمیوں کا اہم میدان ہو گا[20]۔
9۔ ہر مقامی مرد یا عورت پارٹی کا رُکن بن سکتا ہے[21]۔
10۔ تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مفت اور لازمی پرائمری تعلیم اور مفت ثانوی تعلیم۔

11۔ کسانوں اور مزارعوں کو خود کو انجمنوں میں منظم کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

12۔ ہمہ گیر بالغ رائے دہی۔

13۔ ایک "سروراجیہ جمہوریہ" کسی بھی مذہب کو ریاستی مذہب کے طور پر اختیار کر سکتا ہے لیکن تمام مذاہب کے مقدس مقامات مقدس ہوں گے اور تمام گروہوں اور افراد کو مذہبی آزادی حاصل ہو گی، اور مشنری مقاصد کے لیے کسی مذہبی گروہ کو ریاستی امداد نہیں دی جائے گی۔

14۔ تمام زمینوں کو قومیالیا جائے گا اور جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

15۔ بیاج خوری اور سود پر قرض دینے کی ممانعت ہو گی۔

مولاناسندھی نے انڈین نیشنل کانگریس کے ایک ہندوستانی قومیت کے نظریہ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے دو قومی نظریہ دونوں کو مسترد کر دیا۔ اُن کے مطابق ہندوستان یورپ کی طرح ہے۔ جیسے یورپ جرمنوں، اطالویوں، ولندیزیوں، برطانویوں، فرانسیسیوں اور دیگر قوموں پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں پنجابی، پشتون، سندھی، تمل، بنگالی، کشمیری اور دیگر قومیں آباد ہیں۔ لوگوں کا ایک گروہ جو ایک زبان بولتا ہے اور ایک مشترکہ ثقافت کا حامل ہے، قوم کہلاتا ہے۔ اس کسوٹی پر ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ مکہ میں قیام کے دوران کہ زبان کی رکاوٹ کی وجہ سے مثلاً کسی بنگالی حاجی کی مدد نہ کر سکے۔ مولاناسندھی کے نزدیک چونکہ ایک مشترکہ زبان اور ثقافت کسی گروہ میں اتحاد پیدا کرتی ہے اور ایسے گروہ کو قوم کہا جاسکتا ہے، اسی طرح ایسے گروہ جب سمندروں اور پہاڑوں جیسی جغرافیائی حدود کے ذریعے علیحدہ نہ ہوں اور جب وہ کسی علاقے میں اکٹھے رہتے ہوں تو وہ فکری طور پر بھی اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔ یہ فکر یا تو وحدت الوجود جیسی مابعد الطبیعیات پر یا دورِ حاضر میں اشتراکیت جیسے معاشی فلسفے پر مبنی ہو سکتی ہے۔ ان کے خیال میں ایک گروہ جو اس طرح کے فکری اتحاد کا نتیجہ ہو اُسے بیسویں صدی میں مستعمل لفظ 'قوم' کے سخت معنوں میں قومی کے بجائے بین الاقوامی تصور کیا جانا چاہیے۔

مصادر و مراجع

[1] اکرام، شیخ محمد، موج کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 2000ء۔

[2] مولانا عبید اللہ سندھی کی زندگی، مشن اور تعلیمات کو قلمبند کرنے کے لیے سب سے اہم کام محمد سرور (1906-1983)، ظفر حسن ایبک (1895-1989) اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری (1940-2021) نے کیا ہے۔ محمد سرور جامعہ ملیہ دہلی میں تاریخ اور عربی ادب کے پروفیسر تھے، جنہیں سید ذاکر حسین نے

1936 میں مولاناسندھی کے پاس مکہ مکرمہ بھیجا اور جو 1944 میں مولاناسندھی کی وفات تک مولاناسندھی کی صحبت میں رہے۔ مولانا پر ان کی تین اہم ترین تصانیف درج ذیل ہیں:'مولاناعبید اللہ سندھی: حالات زندگی، تعلیم اور سیاسی افکار'، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی: 1976، اشاعتِ اول 1943؛'خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی'،لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی: 1967؛ اور' افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی'،لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، 1972۔ ظفر حسن ایبک افغانستان، روس اور ترکی میں آزادی پسند اور مولاناسندھی کے جونیئر ساتھی تھے ۔ ان کی سوانح عمری 'آپ بیتی' بھی مولانا سندھی کی سیاسی سوانح عمری ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کراچی میں مقیم ایک محقق اور مؤرخ تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اور آزادی کی جدوجہد میں علماء کے کردار پر ایک معتبر شخصیت تھے۔ انہوں نے 1994 میں مولاناسندھی کی 50ویں برسی کے موقع پر مولانا سندھی پر تقریباً چھ کتابیں مرتب کیں۔ مولاناسندھی پر ان کی زیادہ جامع تصنیف 'امام انقلاب مولاناعبید اللہ سندھی: حیات وخدمات (لاہور، دارالکتاب: 2016، اشاعتِ اول 2007) ہے۔

3 اسمٰعیل آفندی کے نام 'مکتوب المدنی 'التفہیمات الالہیہ' کا ایک حصہ ہے، جو مابعد الطبیعیات پر شاہ ولی اللہ کی ایک بڑی تصنیف ہے۔ اس خط میں شاہ ولی اللہ نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی وضاحت کرتے ہوئے ان مابعد الطبیعاتی نظریات میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔

4 یہ کام شاہ ولی اللہ نے اپنی شاہکار تصنیف 'حجۃ اللہ البالغہ' میں کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے اس اہم کام کے زیادہ تر حصے کا ترجمہ مارشیا کے ہر مینسن نے 'The Conclusive Argument from God' کے نام سے کیا ہے۔

5 مولاناسندھی 1915 سے 1922 تک سات سال کابل میں رہے۔ انہوں نے افغانستان میں اپنے قیام کا احوال 'کابل میں سات سال' کے نام سے تحریر کیا (لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی: 1955)۔ ان کے شاگرد مولانا عبداللہ لغاری نے بھی کابل میں اپنے قیام کا احوال 'مولاناعبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل' کے نام سے تحریر کیا۔ مولاناسندھی کی کابل میں سرگرمیوں کے بارے میں کچھ معلومات سرمائیکل اوڈائر، 'India as I knew It (1885-1925)' میں موجود ہے (لندن 1925)۔ آن لائن دستیاب ہے:

https://archive.org/details/in.ernet.dli.2015.276594/mode/2up (accessed on 29th March 2020); and in *Sedition Committee Report* (Calcutta 1918), available online at:

https://archive.org/details/seditionreport00indirich/page/n15/mode/2up (Accessed on 29th March 2020).

[6] مولانا کے مختلف شاگردوں نے مولانا سندھی کی 'تفسیر قرآن' کو مرتب کیا ہے۔ مولانا سندھی نے ایک روسی عالم مولانا موسیٰ جار اللہ (1875-1949) کو عربی میں تفسیر لکھوائی جو بعد میں 'الہام الرحمن' کے نام سے شائع ہوئی۔ موسیٰ جار اللہ کی سیاسی فکر کے لیے ملاحظہ کریں:

Elmira Akhmetova "Musa Jarullah Bigiev (1875-1949): Political Thought of a Tatar Muslim Scholar" *Intellectual Discourse Vol 16, No 1, 49-71, 2008.*

انہوں نے مولانا عبداللہ لغاری کو اردو میں تفسیر لکھوائی جو 'مقامِ محمود' کے نام سے شائع ہوئی۔ مولانا محمد مدنی کو سندھی میں بھی تفسیر لکھوائی۔ شیخ بشیر احمد لدھیانوی نے مولانا سندھی کی بعض سورتوں کی تفسیر بھی مرتب کی۔ یہ تمام تفسیریں ایک حیثیت کی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کے مطابق، سب سے مستند تفسیر جو مرتب کے بجائے مولانا سندھی کے صحیح خیالات کی نمائندگی کرتی ہے 'الہام الرحمٰن' ہے جسے مولانا موسیٰ جار اللہ نے عربی میں مرتب کیا ہے۔

[7] اکرام، شیخ محمد، موج کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، 2000ء۔

[8] سرور، محمد، افادات وملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی، لاہور: سندھ ساگر اکادمی، 1972ء۔

[9] 'مولانا عبید اللہ سندھی: حالاتِ زندگی، تعلیم اور سیاسی افکار'، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی، 1976۔ اشاعتِ اول 1943)، صفحہ 178۔

[10] جماعت کے پروگرام کے لیے ملاحظہ کریں 'خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی'، لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی: 1967۔

[11] اچاریہ کرپلانی (1888-1982) مشہور ہندوستانی سیاست دان تھے جو تقسیم ہند کے دوران کانگریس کے صدر تھے۔

[12] مولانا سندھی نے غلطی سے عبدالمجید کا ذکر کیا۔ دراصل یہ عبدالرحیم سندھی ہی تھے جو اچاریہ کرپلانی کے بڑے بھائی تھے۔

[13] شیخ عبدالمجید (1889-1978)، جن کا پہلا نام جیٹھ انند (ولد لیلارام) تھا جو بنیادی طور پر ٹھٹھہ سے تھے، نے 1908 میں حیدرآباد میں اسلام قبول کیا۔ سیاست میں سرگرم رہے، تحریک خلافت اور مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور بعد میں خان عبدالغفار خان کی سربراہی میں عوامی تحریک میں شامل ہوئے۔ انہوں نے 1937 میں سندھ اسمبلی کے پہلے انتخابات میں حصہ لیا اور سر شاہنواز بھٹو کو شکست دی۔ ان کی سوانح عمری اور کام کے

بارے میں ایک اہم ماخذ 'Shaikh Abdul Majeed Sindhi: His life and Achievements' ہے۔ کراچی: رائل بک کمپنی، 1984 از خان محمد پنہور۔

14 ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری (ایڈیٹر)، 'مقالات مولانا عبید اللہ سندھی سیمینار کراچی 1994'، کراچی: مولانا عبید اللہ سندھی اکیڈمی، 1994۔ صفحہ 86۔

15 ایضاً

16 Faruqi, Ziya-ul-Hasan. *The Deoband School and the Demand for Pakistan.* London: Asia Publishing House, 1963.

17 Moizuddin, M. *The Muslim Luminaries: Leaders of Religious, Intellectual and Political Revival in South Asia.* Islamabad: National Hjra Council, 1988.

18 سروراج، یا شاید زیادہ صحیح طور پر سوراج ایک سنسکرت کا لفظ ہے اور ایک ویدک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے 'خود حکمرانی' یا 'خود انتظامی' ہے۔ ظفر حسن ایبک کے مطابق ہندی میں "سرو" کا مطلب 'سب' ہے، لہٰذا 'سروراج' کا مطلب ہے "سب کی حکومت"۔ اس مصنف کی تحقیق میں یہ سنسکرت کے دو مختلف الفاظ ہیں ایک سوراج (स्वराज) اور دوسرے سروراج (सर्वराज)۔ 'سو' کا مطلب ہے 'خود' اور 'سرو' کا مطلب ہے 'سب' لحاظ سوراج کا مطلب ہے خود پر حکمرانی یا خود کی حکمرانی اور سروراج کا مطلب ہے سب کی حکمرانی۔

19 اس آئین کے اردو متن کے لیے ملاحظہ کریں، 'خطبات و مقالات مولانا عبید اللہ سندھی' (لاہور: سندھ ساگر اکیڈمی: 1967)، اور انگریزی میں متن کے لیے ملاحظہ کریں:

Muhammad Hajjan Sheikh *Maulana Obaidullah Sindhi: A Revolutionary Scholar* (Islamabad, National Institute of Historical and Cultural Research: 1986).

20 مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی (الولی، 1977ء) کے مطابق 1928 میں مولانا سندھی نے اس آئین کی ایک نقل مکہ مکرمہ میں مولانا غلام رسول مہر کو دی، جنہوں نے اسے علامہ اقبال تک پہنچایا۔

21 ہندوستان میں یہ شاید پہلی آئینی کوشش ہے جس میں نسل، طبقے، ثقافت، مذہب اور جنس سمیت تمام سماجی تفاوتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔